تدریسِ اُردو اکیسویں صدی کے تناظر میں:
امکانات ومباحث (معاشی پہلو)

ڈاکٹر روبینہ یاسمین

Dr. Rubina Yasmeen

Department of Urdu,

Govt. Post Graduate College for Women, Sargodha.

Abstract:

In the second decade of the 21st century, the development & growth of the world is speedy; and its mainly due to rapid economic growth. None can ignore the value of a language in the economic growth; for language is the tool of communication between the seller and buyer in the market place. This article reflects the use of Urdu in the economic growth. Furthermore, the ideas to make urdu a language for modern communication in economic sphere are discussed along with the balance of probabilities of its success.

بیسویں صدی میں پرانے صنم خانے مسمار ہوئے اور اُن کی مٹی سے نئے پیمانوں نے جنم لیا۔ ہم بیسویں صدی کے تاریخ ساز عہد سے اکیسویں صدی میں داخل ہو چکے ہیں۔ بیسویں صدی اس لحاظ سے تاریخ ساز ہے کہ اس میں جس تیز رفتار ترقی کا منہ سائنسی ایجادات نے دیکھا اُس کے ساتھ ساتھ علم وادب میں بھی بے تحاشا ترقی سامنے آئی کہ چھاپہ خانے کی ایجاد اور پھر کمپیوٹر نے تو کمال ہی کر دکھایا۔ آج دنیا گلوبل ویلج بن چکی ہے۔ تحقیق کے نئے در وا ہوئے، نئے علوم متعارف ہوئے۔ ادب کے نئے نئے پہلو دریافت کیے گئے۔ تحقیق وتنقید کے نئے زاویے اور پیمانے سامنے آئے۔ زبان وادب جو کسی زمانے میں صرف حظ اٹھانے اور اپنے جذبات کی تسکین کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا اب اس کو بھی سیاسی، سماجی اور معاشی پہلوؤں سے دیکھنے کا عمل شروع ہوا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر زبان ایک سیاسی، سماجی اور ادبی پس منظر رکھتی ہے جبکہ موجودہ دور میں اس میں ایک اور پہلو کا بھی اضافہ ہو گیا ہے اور وہ ہے معاشی پہلو۔ موجودہ دور میں جس کو ہم اکیسویں صدی کا نام دیتے ہیں معیشت کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ معیشت سب سے بڑا ہتھیار ہے اور منڈیوں تک رسائی سب سے اہم ٹارگٹ ہے اور اس دوڑ میں جو آگے نکلے گا دنیا کی باگ دوڑ تھامنے کا اہل ہوگا۔ یہی اس صدی کا سب سے بڑا چیلنج ہے۔(۱)

یوں تو معاشیات انسانی زندگی کا ناقابل تردید پہلو ہمیشہ سے ہے اور رہے گا مگر مادی ترقی اس دور اور اس دوڑ میں جو تیزی موجودہ زمانے میں نظر آ رہی ہے شاید اس سے پہلے کبھی نہ تھی۔ اب زبان و ادب ہی نہیں دنیا کا ہر علم اسی سماجی پہیے کے گرد گردش کر رہا ہے۔ قوموں کی دوستی اور دشمنی بھی اسی کے گرد گھوم رہی ہے۔ اس سلسلے میں ناصر عباس نیئر کی رائے بڑی اہم ہے:

> ''عالمگیریت کی وجہ سے انگریزی کے نوآبادیاتی کردار میں ایک نئی جہت پیدا ہوئی ہے۔ اب یہ سیاسی اور انتظامی اقتدار کے علاوہ معاشی اقتدار اور فارصیت کی زبان بھی ہے۔ اب اس کی مفادات کی نگرانی راجِ برطانیہ نہیں، امریکہ اور اُس کی بڑی بڑی کثیر الاقومی کمپنیاں کرتی ہیں جن کا سرمایہ تیسری دنیا کے بعض ملکوں کی مجموعی قومی پیداوار سے بھی زیادہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں اب انگریزی کی پشت پر انگریزی راج سے بڑی عالمی طاقتیں ہیں۔ ۔۔۔اب انگریزی علم کی معیشت کی نمائندہ ہے۔ انگریزی کی ثقافتی عظمت کا مقابلہ آسان تھا لیکن علم کی معیشت کا مقابلہ آسان نہیں۔ چناں چہ انگریزی بطور عالمی زبان کا مقابلہ اُردو صرف اُسی صورت میں کر سکتی ہے کہ اس میں بھی ایسا علم تخلیق ہو جس کی معاشی قدر عالمی معیار کی ہو۔ ہم اُردو کو علم کی معیشت کا حقیقی مظہر بنائیں۔''(۲)

یہاں معاشی ترقی کے تناظر میں ہمیں اُردو زبان کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔ آج اگر اُردو کو دفتری زبان قرار دیا جاتا ہے تو آج اُردو پڑھنے والوں کی تعداد میں غیر متوقع اضافہ ہوگا۔ ہم انگریزی پڑھنے، لکھنے اور بولنے کو ترجیح کیوں دیتے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ ہم اس سے حظ اٹھا رہے ہیں اس لیے کہ ہمارے یہاں انگریزی دفتری زبان ہے۔ افسری زبان ہے۔ حاکم کی زبان ہے۔ انگریزی دان طبقہ اعلیٰ نوکریوں پر براجمان ہے۔ وہ بااختیار ہے۔ اُس کی عزت ہے تو ہم اُس جاہ حشمت، عزت و شہرت کی خاطر انگریزی سیکھتے ہیں کہ اُردو پڑھ لکھ کر ان ترجیحات تک ہماری دسترس نہیں ہوتی۔ ایچی سن کالج کے تعلیم یافتہ اور گاؤں کے ہائی سکول کے تعلیم یافتہ کا ذہنی تفاوت تاعمر ختم نہیں ہوتا۔ وجہ وہی انگریزی انداز، انگریزی بول چال۔ انگریز ہم پر حاکم رہے اُن کی حکومت تو ختم ہوگئی مگر ہمارے اذہان پر تاحال انگریزی زبان کے ذریعے یہ حکومت جاری و ساری ہے۔

انگریزی دور سے قبل ہم پر فارسی حکمران تھی کہ مغل فارسی بولتے اور سرکاری زبان فارسی تھی۔ لہٰذا فارسی دان طبقہ برتر اور حاکم تھا۔ اُسی زمانے میں اس طرح کی ضرب المثل عام ہوئی کہ ''پڑھے فارسی بیچے تیل، قدرت کے نرالے کھیل'' ہیں۔ مراد یہ تھی کہ فارسی جیسی اعلیٰ زبان پڑھ کے بھی کوئی تیل بیچتا ہے جو ایک عام ان پڑھ بندہ بھی کر سکتا تھا۔ تاریخ پر نظر ڈالیں تو بدھ مت کے عہد میں پالی زبان کو ترقی نصیب ہوئی وجہ کہ پالی زبان بدھ مت کی زبان تھی۔ راجہ اشوک کے عہد میں اس زبان کو سرکاری زبان قرار دیا گیا تو اس زبان نے ترقی کی۔ اُردو میں لکھنے کی روایت دکن سے شروع ہوئی۔ دہلی میں تو فارسی تخت پر براجمان تھی اور اُردو محلّہ تھی۔ دکن میں شاہی سرپرستی میں اُردو پروان چڑھی۔ قلی قطب شاہ کے دیوان کے علاوہ دوسرے شاعروں کی مثنویاں بھی اُسی دور میں ملتی ہیں۔

یہ تو گئے وقتوں کی باتیں ہیں آج کے دور میں چین معاشی جن بن کر سامنے آ گیا ہے۔ ہمارے یہاں کے بچے چین سے چائنیز زبان سیکھ کر ڈاکٹر اور انجینئر بن رہے ہیں جبکہ چائنیز زبان کے رسم الخط یا لہجہ اُردو سے ذرہ برابر بھی میل نہیں کھاتا مگر

معاشی ضرورت نے زبان بھی سکھا دی اور ڈگری بھی عطا کر دی۔ سی پیک کے تحت چین نے پاکستان میں چائنیز زبان کو تعلیمی اداروں میں بھی متعارف کروایا ہے تا کہ گاہک اور منڈی کے رشتے میں زبان اپنا کردار ادا کر سکے۔ چین نے اپنی زبان سکھانے پر محنت کی اور معاشی نکتہ نظر سے زبان کی اہمیت کو سمجھا اور دوسری زبان پڑھ کر سیکھنے سے اپنی زبان کو سیکھنے اور سکھانے کا ترجیحی بنیادوں پر کیا اور نتیجہ ہم سب کے سامنے ہے۔ یہاں ایک واقعہ کا ذکر کرنا مناسب ہوگا۔ چین کے ایک وزیر اعظم دورہ پاکستان پر تشریف لائے تو انھیں انگریزی ترجمان کی پیش کش کی گئی جو اُنھوں نے یہ کہہ کر ٹھکرا دی کہ ''چین گونگا نہیں ہے، ہم اپنی زبان بولیں گے۔ آپ کے ترجمان آپ کی زبان میں سمجھا دیں گے۔ ہم گونگے ہی نہیں اندھے بھی ہیں۔ دوسری قوموں کو مادری زبان میں ترقی کرتے دیکھ کر بھی نہ سیکھ سکے کہ تعلیم و ترقی کا راز مادری زبان میں مضمر ہے۔ جتنی دماغی قوت آپ دوسری زبان سیکھنے اور پھر اُس میں ہنر سیکھنے میں لگاتے ہیں اُسی سے آدھے وقت میں آپ مادری زبان میں وہی چیز سیکھ سکتے ہیں۔ یہاں مثال بالواسطہ اور بلاواسطہ کی ہے۔ جب آپ بلاواسطہ کسی علم تک جاتے ہیں تو آپ کو صرف وہ علم سیکھنا ہے لیکن دوسری زبان میں پہلے آپ ایک ذریعے تک رسائی حاصل کرتے ہیں پھر ہنر تک جاتے ہیں گویا ہم اپنی استعداد کو ضائع کر رہے ہیں۔ ہمیں اپنی زبان کو معتبر بنانا ہے تا کہ اس کی استعداد میں اضافہ ہو۔ ہم دوسروں کو اُردو کیسے سکھائیں گے جب ہم خود ہی نہیں بولتے یا سیکھتے تو دوسروں کو کیسے آمادہ کریں گے۔ یہ امر نہایت خوش کن ہے کہ اُردو بولنے والے دنیا میں بڑی تعداد میں ہیں مگر اُردو کو بحیثیت زبان سکھانا اور اس کا دامن وسیع کرنا، اس کو زمانے کے ساتھ چلنے کے قابل بنانا سرکاری سرپرستی کا متقاضی ہے۔ (۳) یہاں بات کو ایک مثال سے واضح کرنا ضروری ہے۔

گورنمنٹ نے پہلے اُردو اور علاقائی زبانوں میں ایم فل الاؤنس نہیں دیا پھر دوسرے علوم کے ایم فل سکالرز کو پانچ اور زبانوں (انگریزی ماورا ہے) کے ایم فل کو (اڑھائی ہزار) روپے الاؤنس دیا گیا۔ اب اس کو بڑھا کر دوسرے علوم کے برابر کر دیا گیا ہے۔ اب اس معاشی فائدے کے تناظر میں ایم فل سکالرز کی لمبی لائن ہے (یہ اور بات کہ معیار اور تعداد ایک دوسرے کا ساتھ نہ دیں)۔ ہمیں اُردو زبان کی تدریس کے طریق پر نظر ثانی کی ضرورت ہے، ہم آج تک ایک لائن پر ہی حروف تہجی سیکھتے اور سکھاتے رہے۔ جبکہ انگریزی طرز پر چار لائن پر لکھنے سے بہت آسانی سے بچے اُردو سیکھ جاتے ہیں۔

صرف حروف تہجی کے سکھانے اور اُن کی شکل اور آواز ذہن نشین کروا دینے سے اُردو زبان آسان ہو جاتی ہے۔ اُس کے بعد آواز کو جوڑنا سکھا دیں تو مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ دوسری زبان کے لوگ بھی اس کو آسانی سے سیکھ لیتے ہیں۔ ہم نے خود جی سی یونیورسٹی میں جاپانی طالب علموں کو نہ صرف یہ کہ اُردو سیکھتے بولتے بلکہ بہت عمدگی سے لکھتے بھی دیکھا۔ وجہ وہی اساتذہ کی توجہ اور طالب علموں کی لگن۔ ہمارے یہاں جوڑ سکھانے کا عمل زبان سیکھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے کہ طالب علم پہلے حرف کی آواز کو یاد رکھیں پھر دوسرے کی آواز نکالے اور پھر اُن کو جوڑے۔ صرف حروف کی شکل کے بدلنے سے حروف کی آواز بدلنا سکھا دیں تو اس مسئلہ کا آسان حل نکل سکتا ہے۔ اوائل عمری میں بچے پچھلے لفظ کی آواز کو یاد نہیں رکھ سکتے۔ اگر پڑھانے کا صحیح طریقہ اختیار کیا جائے تو پانچ سال کا بچہ بھی روانی سے اُردو کی کتاب پڑھ سکتا ہے اور لکھنے کی مشق سے لکھائی بھی آسان ہو سکتی ہے۔ (۴) یونیورسٹیوں کے اُردو شعبے اس ضمن میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں کہ ماسٹر، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر لسانیات کی طرف توجہ دیں اور اس پر تحقیق کر کے اُردو تدریس کو آسان بنایا جائے تا کہ دوسرے اس زبان کو سیکھ کر پڑھ اور لکھ سکیں۔

کینیڈا کے اسکولوں میں فرانسیسی زبان سیکنڈ لینگویج کے طور پر سکھائی جاتی ہے کیوں کہ فرانسیسی سفارتی زبان ہے اور اس کی اہمیت مسلم ہے۔ اگر ہمیں اکیسویں صدی میں اُردو کو عالمگیریت کی سطح پر لانا ہے تو اس کے لیے ٹھوس بنیادوں پر کام کرنا ہو گا۔ اُردو پر کام تو بھارت میں بھی ہو رہا ہے مگر اُسے سرکاری سرپرستی حاصل نہیں۔ ہمارے یہاں کاغذی ہی سہی مگر اُردو کو سرکاری زبان کہا جاتا ہے۔ دنیا کی بڑی یونیورسٹیوں میں اُردو کے شعبے قائم ہیں۔ ہمارے یہاں کے اساتذہ اور اسکالر جو وہاں جاتے ہیں ان پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف اُستاد بلکہ اُردو کے سفیر کے طور پر بھی کام کریں اور وہ اُردو کو اپنی عام بول چال میں رائج کریں۔

معاشی اصطلاحات کو اُردو میں اس طرح ڈھالا جائے کہ وہ اُردو کا جامہ بھی پہن لیں مگر لفظ ادا کرنے میں دقت نہ ہو۔ اسی طرح بھی ایک رستہ نکالا جا سکتا ہے۔ معاشی لین دین میں، بینک ادائیگی میں بھی اُردو استعمال ہو سکتی ہے اور جتنا اس کا استعمال ہو گا بطور زبان اتنی ہی اس میں وسعت پیدا ہو گی اور ذخیرہ الفاظ بھی وسیع ہو گا۔ کیوں کہ آج کا انسان صرف ایک انسان نہیں، دنیا کی منڈی میں وہ ایک جنس ہے۔ اس سلسلے میں ایرک فرام کی رائے بہت اہم ہے۔ اُس کا کہنا ہے:

> ''انسان اپنے آپ کو ایک ایسی شئے سمجھتا ہے جس کو منڈی میں کامیابی سے استعمال کرنا ہے۔ وہ یہ محسوس نہیں کرتا کہ وہ انسانی صلاحیتوں اور قوتوں کا حامل ہے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ منڈی میں، بازار میں اپنے آپ کی زیادہ سے زیادہ بولی لگوائے۔۔۔۔۔ اُس کا جسم، اُس کا ذہن اور اُس کی روح اُس کا سرمایہ ہیں اور وہ اس سرمائے کو زیادہ سے زیادہ نفع بخش طریقہ سے استعمال کرے۔''(۵)

معاشی تناظر میں اُردو کی اہمیت کو نظر انداز کرنا وقت کی ضرورت سے صرفِ نظر کرنا ہے۔ ہمیں اکیسویں صدی میں معاشی پہیے کے گرد حرکت کرتی ہوئی دنیا کو دیکھنا ہے اور اسی حرکت کے تناظر میں اپنی زبان کی بقا کے سفر کو نہ صرف جاری رکھنا ہے بلکہ اسے تیز رفتاری سے ہمکنار بھی کرنا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد ارشد اویسی، ڈاکٹر، مضمون: قومی یک جہتی کے لیے اردو ناگزیر ہے، مشمولہ: العلم، ادبی مجلّہ، شمارہ ۴، لاہور: لاہور گیریژن یونیورسٹی، ۲۰۱۸ء، ص: ۶۷

۲۔ ناصر عباس نیرّ، ڈاکٹر، عالمگیریت اور اُردو، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء، ص: ۱۷۔۱۶

۳۔ عطاء الرحمٰن میو، ڈاکٹر، مضمون: اکابرین تحریکِ پاکستان کا ایک قرض، مشمولہ: نورِ تحقیق، تحقیقی و تنقیدی مجلّہ، جلد: ۲، شمارہ: ۷، لاہور: لاہور گیریژن یونیورسٹی، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۸ء، ص: ۱۰۵

۴۔ محمد خاں اشرف، ڈاکٹر، مضمون: اردو زبان اور آزادی کے تقاضے، مشمولہ: نورِ تحقیق، تحقیقی و تنقیدی مجلّہ، جلد: ۲، شمارہ: ۷، لاہور: لاہور گیریژن یونیورسٹی، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۸ء، ص: ۴۶

۵۔ ایرک فرام، صحت مند معاشرہ، مترجم: قاضی جاوید، لاہور: وین گارڈ بکس لمیٹڈ، ۱۹۹۱ء، ص: ۱۵۵۔۱۵۴

☆.....☆.....☆